احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں تصورِ انسان دوستی

Humanism In The Short Stories Of Ahmad Nadeem Qasmi

محمد ناصر آفریدی، پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اردو، سرحد یونیورسٹی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پشاور

Ph.D Scholar, Dept. of Urdu, Sarhad ‹M. Nasir Afridi
University, Peshawar

ڈاکٹر تحسین بی بی، صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف صوابی

Dr. Tahseen Bibi
Chairperson, Dept. of Urdu, University of Sawab

Abstract

The main idea of Ahmad Nadeem Qasmi fiction writing is hman being and humanity.Other than this he has also written about Islam and Pakistan.There is the reflection of sensitivity and sympathy in his writings.He is the great torchbearer of humanity and human friendship.There is a great stress on women place and woman respect in his writings.His pen has great power to write about respect and sacredness.He has created such characters different sides of humanity with the help of his reflected writings.His developing thoughts and attitude shows friendship for humanity.He likes to have such writings whch are free of cast system,exploitation and different sects of society.This shows his respct for friendship for humanity with its development.

Key words: Progressivism, Humanism, Compassionate, Tranny, Villege life

کلیدی الفاظ: ترقی پسندی، احترام انسانیت، درد مندی، استبداد، دیہی زندگی

انسانی معاشرے میں اخلاقی نظام کے رائج کرنے کے لیے مذہب انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ دینِ اسلام انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن آشتی کی پیغام دہی کے لیے عدیم المثال ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود، عالم گیر اخوت اور مساوات و یگانگت کے دھارے اِسی دینِ فطرت کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔ دنیاے انسانی کے جُملہ مذاہب خواہ وہ شخصی ہوں یا الہامی انسانیت کے درمیان بُغض و عداوت

اور تعصب و نفرت کے متعامل نہیں ہوتے۔ اِس سب میں انسانیت نوازی کے باب میں اسلام آفاق گیر نظامِ ہستی رکھتا ہے۔ انسانیت نوازی کے اِسی ادبی رجحان کو عمومی طور پر انسان دوستی اور صلحِ کُل کا نام دیا گیا ہے۔ یہی جذبہ کبھی ادب میں وسیع المشربی کا دامن گیر ہوتا ہے اور کبھی انسانیت نوازی کے لیے انسان کی ذات پر مرکوز رہتا ہے۔ اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ دینِ اسلام میں مسجد کے مقابلے میں مساجد زیادہ معتبر اور موَثر ہے۔ دراصل یہی عظمتِ انسانی ہے۔ کیوں کہ:

"توحید باری تعالیٰ کا لازمی نتیجہ عظمتِ انسانی ہے"۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ مذہب میں توحید پرستی کا نظریہ انسانیت کو مساوات کا مِعیار عطا کرتا ہے۔ اسلام نے نسلی تعصبات سے منزہ معاشرے کی عملی داغ بیل ڈالی ہے۔ اسلامی تاریخ کا عہدِ درخشندہ ایسی نادر مثالوں سے بھرپور ہے، جہاں قاضی کے سامنے عام شخص اور خلیفہ برابری کے حق دار رہے ہیں۔ ایسی مثالیں جہاں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے حق میں انصاف کرتے ہوئے مسلمانوں کو سزا دیتے دکھایا گیا ہے، اسلام کی انسانیت نوازی اور مساوات کے ساتھ انصاف کے قیام کی اہم دلیلیں ہیں۔ اِس ضمن میں ژوکنگ نے اعلیٰ اور ادنیٰ انسان کے مابین کرداری حوالے سے درج ذیل حدِ فاصل قائم کی ہے:

> "اعلیٰ انسان گفتار کے ساتھ کردار کا پیکر ہوتا ہے، جب کہ ادنیٰ انسان جانب دار اور تنگ نظر ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسان برتاؤ میں غیر جانب دار اور غیر متعصب ہوتا ہے۔ وہ نیکی کا خیال رکھتا ہے۔ ادنیٰ انسان مادی اشیا کا طالب اور رعایت طلب ہوتا ہے، جب کہ اعلیٰ انسان نظم و ضبط چاہتا ہے"۔(۲)

جدید ادب میں تصوّرِ انسان دوستی ایک مربوط اور وسیع المعانی اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ اِس کا نظریاتی ڈھانچہ مذہبیات اور عمرانیات سے ابھر کر ادبیات میں دخل پاتا ہے۔ یہ نظریہ بھی دیگر نظریات کی طرح ادب اور علوم وفنون میں انسان کی سماجی ضروریات کے پیشِ نظر درآیا ہے۔ جدید ادب میں نظریۂ انسان دوستی کا بڑا زور وشور اور غلغلہ ہے، جو اب باقاعدہ تحریک کا روپ دھار چکا ہے۔ اُردو ادب میں اسلامی طرزِ فکر، معاشرتی طرزِ عمل اور تہذیبی روّیوں نے اسے پھلنے پھولنے کی ساز گار فضا فراہم کی ہے۔ مذہب اور ادب انسان دوستی کے جذبے کے جہاں کہیں ضامن ہیں، وہاں انسان پرستی کی کُھل کر مذمت بھی کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ انسان دوستی کا تصور نظریۂ انسانی اور انسانی حیات

ہی سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے انسانی دوستی کے فروغ میں انسانی نفسیات بھی ایک محرکِ خاص ثابت ہوئی ہے۔ وارث علوی ان تمام تر مثبت پہلوؤں کے باوجود انسان دوستی کو منفی چیز تصور کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک :

> "انسان دوستی کوئی جبلت نہیں، جذبہ نہیں، محض ایک مستعار خود آگاہ رویّہ ہے۔ خود آگاہ رویے سے فن کی اصالت، خلوص اور شدت کی طاقت کم ہوتی ہے اور دکھاوے کا عنصر بڑھتا ہے۔ یوں ادب جذبے کی سادگی اور اصالت سے محروم ہو جاتا ہے"۔(۳)

انسان دوستی کا عمومی تصور شاید اسی جذبے کا عکاس ہو اور ایسے ادیب جن کی تحریریں عمومی طور پر جذبے کی سادگی اور اصالت سے عاری ہوں اور اُن کے شخصی تضادات بھی ایسا نظریہ قائم کرنے کی دعوت دیتے ہوں، لیکن انسانی زندگی اور انسان کے مجموعی طرزِ عمل سے رائج شدہ نظامِ اخلاق، جمالیاتی احساس اور نفسیات انسان دوستی کے نظریے کے حق بجانب ہیں۔ اس کی اہمیت سے ایسی صورت میں انکار ممکن نہیں۔ یہاں راقم کی مراد انسان دوستی کے مثبت پہلو ہی ہیں۔ اس امر کی نفی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے کا عام فرد اگر انسان دوستی کا مظاہرہ کر سکتا ہے، جب کہ ایک فن کار جو عام انسان سے کہیں زیادہ حساس طبع ہو گا، وہ اس جذبے سے کیوں کر عاری ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صلاح الدین درویش کی صراحت زیادہ صادق آتی ہے:

> "انسان دوستی ہر انسان کی جبلت ہے اور ہر اُس انسان کی جو اپنے جیسے انسانوں کے لیے جذبے اور احساس کی دولت رکھتا ہے۔ انسان دوستی کوئی مستعار خود آگاہی بھی نہیں ہے، بل کہ انسان اس کا شعور، انسانی معاشرتی اقدار، روایات، اخلاقیات، نظریات اور اصول و مباحث سے حاصل کرتا ہے۔ انسان دوستی ہر انسان کے لیے تمدنی زندگی کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے"۔(۴)

انسان دوستی سے ایک ایسا فن پیدا ہوتا ہے، جو انسان کو تمام تر کمزوریوں اور محرومیوں کے باوجود استحکام اور حوصلہ عطا کرتا ہے، جس سے انسانی کی سماجی جڑیں اور تقویت حاصل کرتی ہیں۔ مذہبی انسان دوستی ادبی اانسان دوستی کے مقابلے میں آج بھی توجہ طلب ہے۔ جدید عہد کے ترقی یافتہ انسان نے بھی اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ حال آں کہ انسان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر پوری دنیا میں جتنا سرمایہ

صرف کیا جارہا ہے، اُس کا عُشر عشیر بھی دنیاے انسانی کی فلاح و بہبود پر صرف کر دیا جائے، تو کچھ بعید نہیں کہ انسانی معاشرہ انسانی ترقی کے حوالے سے جنت نظیر بن جائے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ادبی انسان دوستی میں بھی ناموزوں پہلوؤں کی بھی عکاسی ادبِ عالیہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہمارا معاشرہ تب ہی پروان چڑھ سکتا ہے کہ جب بین المذاہب انسان دوستی کی فضا کو تعصب، جانب داری، اور انتہا پسندی جیسے سفاکانہ عناصر کے خاتمے کے لیے بہ طور آلہ کار استعمال کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصورِ انسان دوستی کی جڑیں انسانی تاریخ میں پیوست ہیں۔ علومِ انسانی اور انسانیت نوازی اس سے فروغ آشنا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علوم انسانی اور مطالعۂ فن اسی جذبے کے زیرِ اثر ہیں۔ کسی بھی فن کی پیش کش میں انسان مقصود بالذات ہے۔ لہٰذا ہر وہ رشتے جو انسانی فلاح و بہبود اور ترویج و ارتقا کے ضمن میں آئے گی، اُس کے ڈانڈے انسانیت نوازی اور انسان دوستی سے ضرور ملیں گے۔

انسان دوستی کی جدید اصطلاح اردو ادب میں بھی نہ صرف استعمال ہوتی ہے، بل کہ اردو شعر و ادب میں شعوری طور پر نہ صرف اس پر باقاعدہ کام ہوا، اس کے نقوش اور اثرات بھی ادب پاروں سے تلاش کیے جاتے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی کڑی راقم کا موضوع بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو ہر حوالے سے متاثر کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا، جب پوری دنیا پر ترقی پسندانہ خیالات کا شہرہ تھا۔ چناں چہ اردو ادب میں بھی پہلی مرتبہ فن براے زندگی کا نعرہ بلند ہوا۔ یوں پہلی مرتبہ باقاعدگی سے عام فرد کی بات ہونے لگی۔ ترقی پسندیت کے زیرِ اثر طبقاتی کش مکش کا شعور بیدار ہوا اور ہر وہ شخص، جو اس تحریک اور اس کے منشور سے متفق تھا، اُس نے مقدور بھر ادبی خدمات انجام دیں۔

احمد ندیم قاسمی کا تعلق بھی ترقی پسند تحریک کے فعال کارکنوں سے تھا۔ آپ نہ صرف اس تحریک کے تنظیمی ڈھانچے سے باخبر تھے، بل کہ اس سلسلے کی رُکنی کڑی بھی تھے۔ ندیم کے افسانوں میں ترقی پسندانہ خیالات اور طبقاتی شعور ملتا ہے۔ آپ کے افسانوں میں غریب اور نادار دیہی زندگی کی واضح جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ نے پنجاب کی دیہی زندگی کے جبر واستبداد اور رنج و محن کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ سماجی مسائل کا بیان اور حقیقت نگاری ندیم کے افسانوں میں ایک برقی رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بیانیہ انداز میں اپنی کہانیوں میں سسکتی ہوئی انسانیت کا نوحہ رقم کیا ہے۔ انھوں نے مقصد کو فن پر قربان نہیں کیا۔ کیوں کہ اُن کی ترقی پسندیت اس بات کی متقاضی تھی کہ فن کو زندگی کے مسائل اور الجھنوں کی پیش کش کا آلہ کار بنایا جائے۔ چناں چہ وہ اس حوالے سے ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صادق نے ندیم کے بارے میں لکھا ہے:

"احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں اکثر اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ افسانے کے فن کو مقصد کے پیروں تلے روندا گیا ہے"۔(۵)

ندیم کے افسانے انسانی معاشرے کے تعصبات اور رویوں کی بے اعتدالیوں کی نفی کرتے ہیں۔اُن کی ترقی پسندیت ماورائے انسانیت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اُن کا دلِ درد مند انسانیت کو کسی حال میں مصیبت زدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ فرد کی ذات سے لے کر معاشرہ اور معاشرے سے لے کر قوم تک انسانیت نوازی اور مسلک صلح کل کے معیار پر پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت قریباً ہر طرف تعصب اور فرقہ واریت کی بُو آتی ہے۔ایک ایسی فضا چل پڑی تھی، جس میں ہر کوئی انتقام کے درپے تھا۔ایسے گئے گزرے حالات میں بھی قاسمی کا قلم انسان دوستی کی فضا کا ضامن دکھائی دیتا ہے۔آپ نے اپنے افسانے "ارتقا" میں ہندو مسلم فسادات کی نفی کرتے ہوئے سماجی ہم آہنگی اور انسان دوستی کو بڑے مؤثر پیرایے میں بیان کرتے ہوئے اتحاد و یگانگت اورانسان دوستی کا ثبوت باہم پہنچایا ہے۔اس افسانے سے بہ طور مثال درج ذیل مکالمات ملاحظہ ہوں:

"اور پرشو بھیا! یہ کوئی اتنی مشکل بات بھی نہیں۔اب ہمارا یہ ننھا سا گاؤں ہے، ہندوؤں، سکھوں کے یہی آٹھ دس گھر ہوں گے، پر خدا لگتی کہنا پرشو بھیا! کبھی تمھیں یا تمہارے بھائیوں کو ہم مسلمانوں نے چھیڑا؟ نہیں نا؟ کتنے میٹھے لگتے ہو تم، جب ہماری خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہو"۔(۶)

اردو ادب میں بھی ایسی بے مثال کہانیاں موجود ہیں، جہاں غیر مسلموں کی حقوق براری کے دوران میں عظمتِ انسانی اور تقویم انسانی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ قاسمی کی افسانہ نگاری سے قطع نظر شاعری بھی انسان دوست جذبات سے مالا مال ہے۔ادب کا موضوع انسانی زندگی ہونے کے ناطے ندیم نے اپنے افسانوں میں انسانیت کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُن کے مسائل کا ادراک کیا ہے۔اُنھوں نے اسلام کی عطا کردہ تعلیمات کے عین مطابق اپنے افسانوں خصوصاً ارتقا، جلسہ اور پرمیشر سنگھ میں انسان دوستی کی فضا کو تقسیمِ ہند کے تناظر میں کہانیوں کا روپ دیا ہے۔ندیم نے اپنے گرد و پیش اور سماج پر گہری نظر رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے کردار تخلیق کیے ہیں، جو ہمارے معاشرے سے متعلق تھے اور ان میں کسی قسم کی غیریت کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ ندیم کی انسان دوست فکر یہاں کمال ہنروری سے کہانی تخلیق کرتی دکھائی دیتی ہے۔اس ضمن میں ندیم کے متذکرہ بالا افسانے "ارتقا" ہی سے ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

> " تمھیں یاد ہے نا، گئے برس تمہار کوئی پنڈت آیا تھا یہاں۔ مندر میں روشنی کی ضرورت پڑی تو ہم نے اپنی مسجد کا گیس بجھوا دیا، یاد ہے نا؟ یہ بھولنے کی باتیں ہی نہیں اور تم یہ شکایت لے کر آئے ہو کہ چاند نے رام لال کے گھونسا مارا اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہو کہ تم ہندو اور ہم مسلمان ہیں اور تم کم ہو اور ہم زیادہ ہیں "۔(۷)

ندیم ایک حساس فن کار کی حیثیت سے ہر اچھے برے کردار پر گہری نظر رکھے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے انسان دوستی اور انسانیت نوازی کے پیش نظر ایسے ایسے کردار بھی تخلیق کیے ہیں، جو انسانیت کی ذات کے لیے سوہانِ روح ہیں۔ ایسے کردار مسیحاؤں کے روپ میں اپنوں کے لیے غیروں سے بدتر سلوک کے متعامل ہیں، چہ جائے کہ دوسری اقوام کے ساتھ اُن کے انسانی سلوک کی توقع کی جائے۔ چناں چہ ندیم نے ایسے پیشوں کو بے نقاب کیا ہے، جو مسیحائی کی آڑ میں انسانیت کے جذبات اور دھن سے کھیل جاتے ہیں۔ انھوں نے بڑی مہارت سے سماج کی اُن کالی بھیڑوں کو بے نقاب کیا ہے، جن کے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے پیشہ ور افراد سے انسان دوستی اور انسانیت نوازی کی توقع کرنا بھی خیال خام ہے۔ انھوں نے افسانے دیہاتی ڈاکٹر میں ایسی ہی مثال پیش کی ہے، جس کی نظر میں انسانیت کی کوئی قدرو قیمت نہیں بل کہ دھن پروری ہی اس کا نصب العین ہے۔ مسیحائی کے لبادے میں انسانیت کشی کی بھیانک مثال دیکھیے، جس میں ندیم کا دلِ دردمند اور حساس جذبہ واضح نظر آتا ہے:

> " آپ کا رویہ غریب کسانوں کے لیے اچھا نہیں۔ آپ کو تو ہر ایک سے مہربانی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے "۔(۸)

ایسے کرداروں کو بے نقاب کرنے کا بنیادی مقصد انسانیت کی خدمت کے لیے مثالی پیشے کے انتخاب کے باوجود فرائض منصبی کی انجام دہی میں نہ صرف کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ ہے، بل کہ دھن پروری کی آڑ میں انسانیت سوزی ان کا شعار ہوتا ہے۔ آج کی جدید دنیا میں ایسی سوچ رکھنے والے پیشہ ور افراد کی سوچوں کے لیے طبقاتی کش مکش فرقہ واریت اور تعصب کے فروغ کے لیے ندیم کی فکر تازیانے سے کم نہیں دکھائی دیتی۔ اُن کی نظر میں تو ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی اور یہودی وغیرہ سب کے سب بنیادی طور پر انسان ہیں۔ ان سب کے ساتھ انسانی سلوک کی روائی انسانیت کا تقاضا ہے۔ انسان اس معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ انسانوں سے معاشرہ بنتا ہے۔ کوئی بھی مذہب انسانیت کے اندر سماتا ہے، تو انسانیت

مذہب کا شعار بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرت اور ثقافت کا کینوس مذہب سے کہیں زیادہ وسیع تر ہوتا ہے۔

ندیم کے ایسے کردار انسان دوستی کے باب میں قدرے ردوبدل کے ساتھ پوری انسانی معاشرے اور نفسیاتِ انسانی پر محیط ہیں۔ دنیا کے کسی خطے کو لیجیے۔ انسانی رویوں میں ایساہی تصادم اور تہذیب دیکھنے میں آئیں گے۔ ندیم نے اپنے اطراف وجوانب اور عہد سے انسان دوستی کی تقویت اور انسانیت نوازی کے لیے کرداروں کا انتخاب کرنا تھا، سو کیا ہے۔ البتہ ان کرداروں کی پیش کش کے درپردہ پیغام آفاقی نوعیت ضرور رکھا ہے۔ کیوں کہ یہ افراد اور سماج کی کہانیاں ہیں۔ ندیم نے درج ذیل اقتباس میں ایساہی کردار پیش کیا ہے، جو انسان کے فروغ وارتقا کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ چند مکالمے بہ طور مثال دیکھیے:

> "قسم خدا کی! دوسرے مسلمان کی نیتوں کی، تو وہی جانے، اپنے بارے میں، تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری طرف سے کبھی میل نہیں آیا۔ تم میرے خدا کو اچھا کہتے ہو، میں تمہارے پرماتما کی عزت کرتا ہوں، تم نے میرے محمدؐ پر انگلی نہیں اٹھائی۔ میں نے تمہارے رام میں کوئی نقص نہیں نکالا"۔(۹)

ہر مذہب بنیادی طور پر انسان کی بھلائی اور اُسی کی برتری کی بات کرتا ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات اور احسن المخلوقات ہونے سے کس کو مجالِ انکار یارائے انحراف ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انسان معاشرے کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو احمد ندیم قاسمی اچھی طرح پہچانتے تھے۔ دینی فکر اور بے میل عقیدہ رکھتے ہوئے انسانیت کی بات کرنا اور انسانیت کے لیے دلِ درد مند رکھنا ندیم کی فکر کا محور و مرکز رہا ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اقتباس میں انھوں نے امن و آشتی، بھائی چارے اور مساوات کا درس قائم کیا ہے، جو انسان دوستی کا بہترین حوالہ ہے۔ اس ضمن میں ندیم کے افسانے "جلسہ" سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

> "مترو میں تمہارا ایک ادنیٰ داس تمہارے چرنوں میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ میں ایک ایسے اناتھ آشرم کے لیے تم سے مدد مانگوں، جس کی نیو میرے ہی ان پاپی ہاتھوں نے رکھی تھی اور جس میں اس نگری کے اناتھ بالک ودیا کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں"۔(۱۰)

ندیم نے اپنے افسانے "پرمیشر سنگھ" میں انسان دوستی اور انسانیت پروری کی ایسی ہی مثال قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مثال قائم کی ہے کہ جہاں غیر مسلموں کے سفاکانہ رویے سے مسلمانوں کو ان کے دین فطرت سے بہ زور بازو سکھ دھرم

اختیار کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ تقسیمِ ہند کے تناظر میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ خصوصاً سکھوں نے مسلمان عورتوں کو زبردستی سکھنیاں بنا کر ان سے شادیاں کی ہیں۔ آج بھی ایسی بہت سی اغواہ شدہ بے بس مسلمان عورتیں سکھوں کے گھروں میں بڑھاپے کی حالت میں موجود ہیں، جہاں ان کی کوکھ سے جنم لینے والی سکھ نسل دائرہِ اسلام سے خارج ہے، جس کا انھیں از حد افسوس ہے۔ دوسروں کے مذہب اور دھرم کے ساتھ کھیلنا انسان دوستی کے نظریے کی بیخ کنی کرتا ہے۔ ندیم کا افسانہ "پرمیشر سنگھ "ایسی ہی مثال ہے۔ جس میں وہ آگے چل کر انسانیت کی رمق کو زندہ کرتے ہوئے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے انسان دوستی کی فضا ہموار کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانے سے ایک مثال دیکھئے :

> "مرد بھی جمع ہوگئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اُسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں"۔(۱۱)

مذاہبِ عالم احترامِ انسانیت میں خواتین کے احترام کے داعی رہے ہیں۔ انسان دوستی کا نظریہ بھی ایسی ہی سوچوں کا پرچارک ہے۔ جدید اردو ادب میں بالعموم اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں بالخصوص عورت کی عزت و تقدیس کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ ندیم کے افسانے "سفید گھوڑا" میں احترامِ نسوانی اور انسان دوستی کی مثال ملاحظہ کیجیے:

> "یہ عورت والا واقعہ چھوڑو۔ عورت کسی نہ کسی کی بیٹی یا بیوی یا ماں ضرور ہوتی ہے اور ہم پاکستان کے رہنے والے ہیں اور یہ رشتے آج بھی ہمارے لیے مقدس ہیں"۔(۱۲)

انسان دوستی احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں کئی ایک جہتوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی فکری دنیا میں اس نظریے کو کہانی کی بنیادی موضوعی ساخت کا حصہ بھی بناتے ہیں اور متنوع کرداروں کے ذریعے بھی۔ ان کی انسان دوستی بین المذاہب بھی نظر آتی ہے اور اس کا اظہار ثقافتوں کے امتزاج سے بھی ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد حسین تارڑ، روحانیتِ اسلام اور سائنس، ملتان: روحانی آرٹ پریس، س ن، ص ۱۷۲

۲۔ لالہ ہردیال، مذاہب اور انسانیت، لاہور: راج پیت رائے اینڈ سنز ، ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۱

۳۔ وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، لاہور: نگارشات، ۱۹۸۶ء، ص ۴۹

۴۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش، انسان دوستی نظریہ اور تحریک، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۷

۵۔ ڈاکٹر صادق، ترقی پسند ادب اور اردو افسانہ، دہلی: ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۵

۶۔ احمد ندیم قاسمی، افسانہ: ارتقا، مشمولہ: آس پاس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۳

۷۔ ایضاً ص ۸۳

۸۔ احمد ندیم قاسمی، افسانہ: دیہاتی ڈاکٹر، مشمولہ: چوپال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۹۔ یضاً۔ ص ۸۴

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، طلوع و غروب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۳

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، بازارِ حیات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۷۰